P. O. RGD. No. A 922

ہماری زبان

انجمن ترقی اُردو (ہند) علیگڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

سالانہ چندہ دو روپے

قیمت فی پرچہ دو آنے

جلد ۱۰	۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء	ایڈیٹر ـ قاضی عبدالغفار	۱۲ ذی الحجہ ۱۳۷۰ ہجری	نمبر ۴۲

کچھ اپنی باتیں

صدر جمہوریہ اور زبان کا مسئلہ

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندرا پرشاد حال ہی میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے موصوف نے زبان کے مسئلہ کے بعض اصولی پہلوؤں پر زور دیا۔ آنہوں نے مادری زبان میں تعلیم دینے کے متعلق یہاں تک فرما دیا کہ شروع سے آخر تک ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہونی چاہئی۔ پھر انہوں نے "لسانی پاکیزگی" پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے کو برا کہا اور فرمایا کہ ہر زبان کو عوام کی زندگی اور زبان سے قریب ہونا چاہئی اور یہہ کہ دوسری زبانوں کے رایج الفاظ کو شامل کرنے پر کسی زبان کے حامی کو اعتراض نہ ہونا چاہئی۔

اس کے بعد محترم صدر نے علاقائی زبانوں کے مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر فرمائے اور اس بات پر زور دیا کہ ہر علاقے میں اُسی علاقہ کی زبان کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئی ـ انہوں نے فرمایا کہ یہہ اصول اُسی صورت میں قابل عمل ہوگا جب کہ کسی ایک علاقہ میں کسی ایک زبان کے بولنے والوں کی تعداد "قابل لحاظ" ہو۔ ہر علاقہ کی زبان کی ترقی کی کوشش اس طرح کرنی چاہئی کہ اس کی موجودہ بنیادوں پر دوسری ہم وطن زبانوں سے رایج اور عام فہم الفاظ لئے جائیں۔ اس کے علاوہ ہر علاقائی زبان کے ارتقا کا رخ ایک ایسی زبان تیار کرنے کی جانب ہو جسے زیادہ سے زیادہ عوام سمجھہ سکتے ہوں ـ

حیدرآباد میں اُردو زبان کے متعلق ڈاکٹر راجندر پرشاد نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا کہ:۔

"اس ریاست میں تین زبانیں ہیں جن کو عوام مخصوص علاقوں میں بولتے ہیں ـ یہہ ریاست اس بات کی ہر ممکنہ کوشش کرتی رہی ہے کہ اُردو کو ترقی دی جائے میں اُردو کو اُسی زبان کی ایک شکل سمجھتا ہوں جسے ہمارے دستور نے یونین کی زبان قرار دیا ہے

باوجودیکہ اس کا رسم الخط اور اس کے الفاظ مخصوص ہیں ۔ اس لئے اردو کے لئے بھی اسی مسئلہ کو حل کرنا ہے جیسے ہمارے بہت سی زبانوں والے ملک کو حل کرنا ہے"۔

محترم صدر نے حیدرآباد کے لسانی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان کے مسئلہ کا بالکل ادھورا ذکر کیا اور اس کا کوئی حل پیش نہیں کیا ۔ حقیقت یہہ ہے کہ حیدرآباد میں تین علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو چوتھی مشترکہ زبان ہے جس کو اس طرح ترقی دی گئی تھی کہ تینوں زبانوں والے اس سے کام لے سکیں اور وہ ان سب کے درمیان اظہار خیال اور بات چیت کا ذریعہ بن جائے ۔ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی تھی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے علاقائی زبانوں کے اختلافات کو بہت کم کر دیا تھا ۔ جس طرح ہمارے دستور میں ہندی کو سرکاری زبان بنا کر ملک کی تمام زبانوں کے درمیان ایک مشترک واسطہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اسی طرح حیدرآباد میں اردو کو تینوں علاقائی زبانوں کے درمیان ایک مضبوط کڑی بنایا گیا تھا ۔ اب بھی تمام اضلاع میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اردو ہی مشترک زبان ہے اور خاص شہر حیدرآباد اور اس کے نواح کی تو وہ مسلمہ طور پر علاقائی زبان ہے ۔ محترم صدر کی تقریر نے اس مسئلہ کے حل کرنے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی کہ اگر حیدرآباد کی تین علاقائی زبانوں کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے (اور ایسا ضرور ہونا چاہئے) تو اردو کو جو خود محترم صدر کے قول کے مطابق ہندی ہی کی ایک شکل ہے، زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا کیا موقعہ دیا جائیگا ۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ ایک مشترک زبان کی حیثیت سے حیدرآباد میں اردو اپنا ایک مقام معین کر چکی ہے ۔ اندیشہ یہہ ہے کہ تینوں علاقائی زبانوں کی ترقی کے کہیں یہہ معنی نہ ہوں کہ اردو کو ختم ہی کر دیا جائے ۔ معلوم نہیں کہ اس معاملہ میں حیدرآباد کے حامیان اردو کا نقطہ نظر کیا ہے اور وہ کیا سوچ رہے ہیں لیکن وہ جو کچھہ بھی سوچ رہے ہوں انہیں غافل نہ رہنا چاہئے ۔ حیدرآباد میں اردو زبان بلا شبہ ایک علاقائی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اس حیثیت کو برقرار رکھنا چاہئے ۔ سارے ملک میں عثمانیہ یونیورسٹی ہی ایک یونیورسٹی ہے جس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے ۔ یہہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مختلف علاقوں میں وہاں کی علاقائی زبان کی ایک یونیورسٹی ہونی چاہئے جس میں علاقائی زبان ذریعہ تعلیم ہو ۔ اگر ریاستوں کے لسانی تقسیم کے اصول پر عمل کیا گیا تو بلا شبہ ہر علاقہ اپنے لئے ایک یونیورسٹی بنائیگا اور اس یونیورسٹی میں اسی علاقہ کی زبان ذریعہ تعلیم ہوگی ۔ دستور کی ۱۴ زبانوں میں سے ایک اردو بھی ہے جس کی ایک یونیورسٹی اس وقت موجود ہے ۔ اس یونیورسٹی کے بنیادی اصولوں کو مسمار کر کے اردو کو یونیورسٹی سے خارج کرنے کی کوشش کسی طرح بھی قرین انصاف نہ ہوگی ۔ علاوہ بریں سالہا سال کی محنت اور کروڑوں روپیہ کا خرچہ برداشت کر کے مشترکہ زبان کی یونیورسٹی کے جس تخیل کو پروان چڑھایا گیا ہے اس کو اب برباد کر دینا، اس محنت اور روپیہ کو برباد کرنا ہے جو اس تصور پر خرچ کیا گیا ۔ بہر حال ایک وقت آئیگا جب علاقائی زبانوں کی یونیورسٹیاں قایم ہوں گی اور اس وقت ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ ۱۳ زبانوں کی یونیورسٹیاں قایم ہوجائیں اور چودھویں زبان کی یونیورسٹی قایم نہ ہو ۔ جب یہہ یونیورسٹی پہلے ہی سے قایم ہے تو اس کو قایم رکھنا چاہئے ۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ہندی زبان کی تعلیم پر جتنا زور بھی دیا جائے ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا ذریعہ تعلیم کو بدلنے کی کوشش تنگ نظری کی دلیل ہوگی ۔

محترم صدر نے اپنا یہہ خیال ظاہر فرمایا کہ اردو در اصل ہندی ہی کی ایک شکل ہے، البتہ اس کا رسم الخط جداگانہ ہے ۔ اس موقعہ پر اُس سمجھوتہ کا بھولنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے جو مہاتماجی کی رہنمائی میں خود ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق صاحب کے درمیان ”ہندستانی“ کے متعلق ہوا تھا اور جس میں یہہ طے پایا تھا کہ ہندستانی زبان، دیوناگری اور اردو رسم الخط کے ساتھہ ملک کی قومی زبان ہوگی ۔ اُس کے بعد سے گنگا اور جمنا میں اتنا پانی بہہ چکا ہے کہ اب یہہ سوال کرنا بھی فضول ہے کہ خود صدر جمہوریہ نے جب وہ مجلس دستور ساز کے صدر تھے اور جب یہہ مسئلہ اُس مجلس کے سامنے زیر بحث تھا مہاتماجی کے اس فیصلہ سے ہٹ جانے پر کس طرح اپنی امادگی ظاہر کی ہوگی لیکن بہر حال عثمانیہ یونیورسٹی کی حد تک اب بھی صدر جمہوریہ اس بات پر زور دے سکتے ہیں کہ وہاں ”ہندستانی“ (اردو کی زیادہ عام فہم شکل) دونوں رسم الخط میں جاری رہے اور ملک کی چودھویں زبان کا یہہ ادارہ اپنی موجودہ شکل میں قایم رکھا جائے ۔

ملک کی سیاست کے پیچ و خم نظر کے سامنے ہیں اس وقت ٹھنڈے دل سے سوچنے اور سنجیدہ مسایل پر سنجیدگی کے ساتھہ غور کرنے کی اہلیت تقریباً مفقود ہو گئی ہے ۔ یہہ کام ہمارے ایسے لیڈروں کا ہے جنھوں نے ”باپو کے قدموں میں“ بیٹھہ کر تربیت حاصل کی ہے کہ وہ تعصبات کی دیوانگی روکیں اور پارٹیوں اور جماعتوں کی خواہشوں کو مفاد عامہ پر حاوی نہ ہونے دیں ۔

کیا آواز سنی گئی

اردو کے اخباروں میں حسب ذیل خبر شایع ہوئی اور لکھنو سے انجمن کی شاخ نے بھی ہمیں اطلاع دی ہے کہ لکھنو میونسپلٹی کے سپرنٹنڈنٹ تعلیم نے :-

”یہاں کے اسکولوں کے نام ایک سرکلر جاری کیا ہے جس میں ہیڈ ماسٹروں کو ہدایت دی گئی ہے کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے اور مادری زبان وہی ہے جو سرپرست بتلائیں ۔ جو بچے خواہش کریں ان کو اردو کی تعلیم ضرور دی جائے گی ۔ گشتی کا متن حسب ذیل ہے :-

”آپ لوگوں کو پچھلے آدیشوں (ہدایتوں) کے سلسلے میں سوچت کیا جاتا ہے کہ شکچھا کا ادھیم چھاتر کی ماتر بھاشا میں ہوگی ۔ یدی کوئی بالک اردو پڑھنا چاہتا ہے تو اس کو اردو بھاشا اوشیہ پڑھائی جائے ۔ پرنتو ہندی بھاشا کا گیان انی واریہ ہوگا ۔ چھاتر کے پاٹ شالہ پردیش ہوتے سمے سن رکچھہ شک دوارا پردیش پتر میں آپ روکت الیکھہ بھی ہونا چاہئے“ ۔

ترجمہ

آپ لوگوں کو پہلی سرکاری ہدایتوں کے سلسلے میں مطلع کیا جاتا ہے کہ تعلیم کا ذریعہ طالب علم کی مادری زبان ہوگی ۔ اگر کوئی بچہ اردو پڑھنا چاہتا ہے تو اس کو اردو زبان ضرور پڑھائی جائے لیکن ہندی زبان کا سیکھنا لازمی ہوگا ۔ طالب علم کے اسکول میں داخل ہوتے وقت سرپرست کے ذریعہ مذکورہ بالا بات کی وضاحت بھی کرلی جائے ۔

یہہ سرکلر ۱۰ اگست کو جاری کیا گیا اور اب تک سب اسکولوں میں پہونچ چکا ہے“ ۔

گذشتہ مئی کے آخری ہفتہ میں جو وفد اتر پردیش کے وزیر تعلیم کی خدمت میں گیا تھا اور جو محضر اُس نے دس ہزار دستخطوں کے ساتھہ پیش کیا تھا اگر یہہ سرکلر اسی کا نتیجہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک حد تک ہماری یہہ کوشش شاید بار آور ہو جائے ۔ ”شاید“ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ پہلے بھی اس قسم کے سرکلر جاری ہو چکے ہیں مگر ماتحت حکام نے ان کی خلاف ورزی کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا ۔

وزارت تعلیمات کا سب سے ضروری

کام یہہ ہے کہ وہ یہہ دیکھے کہ اس کی گشتی کی پوری پوری تعمیل ہوتی ہے یا نہیں۔

سرپرستوں کا یہہ کام ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسوں میں داخل کرانے کی کوشش کریں اور جہاں بھی اردو کی تعلیم کے متعلق انھیں دشواری پیش آئے مرکزی انجمن کو اطلاع دیں۔

ہماری تمام شاخوں کا یہہ کام ہے کہ وہ معلوم کریں کہ ان کے ضلع میں یہہ گشتی پہنچی یا نہیں اور اس پر عمل ہوا یا نہیں؟

آپ ہی ہم معلوم کرسکینگے کہ ہماری جدوجہد کا کیا نتیجہ نکلا۔ ایسے مسایل میں ضروری ہوتا ہے کہ آن مسایل کا مسلسل تعاقب کیا جائے۔ اگر ہماری شاخیں ہمیں صحیح حالات بتاتی رہینگی تو ہم وزارت تعلیمات کو آس کے وعدے یاد دلاتے رہینگے اور کیا عجب کہ آردو کی تعلیم کے متعلق یہہ ایک بڑی شکایت باالاخر رفع ہوجائے بہر حال اس جدوجہد سے اتنا تو فایدہ ضرور ہوا کہ ہماری لکھنو کی شاخ نے دوسری شاخوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال قایم کردی اور یہہ بتا دیا کہ کوئی جماعت حقدار نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں اپنے حقوق کے طلب کرنے کی ہمت نہ ہو۔

ہلکے ہلکے اشارے

.......یہہ اتر پردیش کی سرکاری زبان ہے:-

"آپ لوگوں کو بچانے اپدیشوں کے سلسلہ میں سوچت کیا جاتا ہے کہ شکچھا کا ادھیم جہاتر کی ماتر بھاشا میں ہوگی۔ یدکوئی بالک آردو پڑھنا چاھتا ہے تو اس کو آردو بھاشا اوشیا پڑھائی جائے۔ پرنتو ھندی بھاشا کا گیان آنی وار ہوگا ... ... وغیر وغیرہ"

اس زبان کی پاکیزگی کو خراب کرنے والے اگر کچھہ لفظ اس عبارت میں موجود ہیں تو وہ "سلسلہ" "چاھتا ہے" "پڑھائی جائے" وغیرہ ہیں جن سے ملک کی تہذیبی وحدت (مصنفہ ٹنڈن جی) خراب ہوتی ہے!!

..........پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر تعلیم نے بتایا کہ علی گڈھ یونیورسٹی میں شروع ہی سے آردو زبان لازمی رہی ہے۔ البتہ اب اتنا فرق کردیا گیا ہے کہ طلبا کو یا تو آردو کا مضمون ابتدائی ھندی کے ساتھہ لینا ہوگا یا ھندی کا مضمون ابتدائی آردو کے ساتھہ۔

دیکھئے نا اب وہی خرابی پیدا ہوگئی کہ دونوں رسم الخط سکھائے جائینگے، حالانکہ "بابو" کے اس غلط خیال کی تصحیح بڑی مشکل سے کی گئی ہے! ھندی کی پاکیزگی کا بھی کچھہ تو خیال کرنا تھا۔

... .اس دفعہ یوم آزادی کی تقریب میں لکھنو ریڈیو نے اپنی مسرت کا اس طرح اظہار فرمایا کہ اپنے پروگرام کو آردو زبان سے بالکل پاک رکھا! یعنی ریڈیو کے یوم آزادی میں آردو زبان شریک نہ تھی! "اکاش وانڑی" کے تقدس کو آردو جیسی زبان سے آلودہ کرنا ایک گناہ ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ریڈیو نے اپنا فرض محسوس کیا اور آزادی کی تقریب سے آردو زبان کو دور ہی رکھا! وزیر اعظم سے ہم سفارش کرتے ہیں کہ وہ لکھنو ریڈیو کو کوئی بڑا سا انعام دیں۔

.... یہہ بات سمجھہ میں نہیں آتی کہ لوگ شکایت کیوں کرتے ہیں۔ اتر پردیش کا معاملہ تو شکوہ و شکایت کی حدود سے گذر چکا ہے!!

۔......"قومی زبان کے سوال کے متعلق ہندو رعایا کا دو تہائی ہندی چاہتا ہے، مسلمان اس کے بہت خلاف ہیں ایک چھوٹی تعداد (دس فی صدی سے کم مسلمان) ہندی کو پسند کرتے ہیں۔ "ہندستانی" کی تائید ۸۰ فی صد مسلمان کرتے ہیں۔ ہندو رعایا میں سے بھی ایک تہائی سے کم اس کے موافق ہیں۔ شرنارتھیوں کی اکثریت ہندستانی کی تائید کرتی ہے۔ اردو کو شرنارتھیوں اور ہندوؤں نے نامنظور کر دیا ہے۔ سنسکرت کو نہ تو شرنارتھی پسند کرتے ہیں اور نہ مسلمان۔ ہندوؤں کی ایک چھوٹی تعداد ۵ فی صد سے بھی کم اس کی تائید کرتی ہے ......" یہ یونسکو کی ایک جماعت کی رائے ہے جو اترپردیش کی ریاست میں اختلافات کی تحقیقات کر رہی تھی۔ اس تحقیقات کے نتیجہ میں ہندی، ہندستانی اور اردو کو جس طرح ملا جلا کر ایک کھچڑی پکائی گئی ہے اس سے اس "تحقیقات" کی "بالیدگی" ظاہر ہوتی ہے۔ سبحان اللہ کیا تحقیقات ہے کہ ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ اردو اور ہندستانی میں فرق کیا ہے اور اصل ہندی ہے کیا۔ "ماہرین" کی یہ تحقیقاتیں بعض وقت جُہلا کے تعصب سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہیں!!

آہ مولوی مہیش پرشاد

ہم نے یہ خبر نہایت افسوس اور دلی رنج سے سنی کہ مولوی مہیش پرشاد پروفیسر شعبہ عربی و فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔ آپ کی صحت ایک مدت سے خراب تھی۔

مولوی مہیش پرشاد ضلع الہ آباد کے ایک معزز کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو فارسی کی تعلیم کے بعد آپ نے عربی کی طرف توجہ کی اور لاہور چلے گئے۔ آپ مولوی عبداللہ ٹونکی کے بہترین شاگردوں میں تھے۔ وہیں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کی ڈگری لی۔ اس یونیورسٹی میں یہ عربی کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ اسی سے ان کے نام کے پہلے مولوی لکھنا رسم ہو گیا تھا۔

پروفیسر مہیش پرشاد غالبیات۔ خصوصاً خطوط غالب کے بڑے ماہر اور محقق تھے۔ خطوط غالب پر شاید اتنا شغف کسی کو نہ تھا جتنا ان کو تھا۔ ان مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے مرتب کیا تھا جو الہ آباد کی ہندستانی اکیڈیمی نے شائع کیا تھا۔ ایک اور مجموعہ تیار تھا مگر وہ خود ہی آخری سفر کو تیار ہو گئے۔

مولوی مہیش پرشاد نہایت ملنسار، اور مرنجان مرنج آدمی تھے ہمیشہ خوش رہتے اور ہر ایک کو خوش رکھتے۔ نہایت ہنس مکھ اور صاف دل آدمی تھے۔ اردو سے خاص دلچسپی تھی۔ ابتدا سے ہماری انجمن کی مجلس عاملہ میں شامل اور اس کے سرگرم ورکروں میں تھے۔ عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ ساٹھ پینسٹھ کے درمیان ہوں گے۔ یہ جگہ جو خالی ہوئی ہے شاید خالی ہی رہے۔ ہمیں اور انجمن کو آپ کے پس ماندوں سے دلی ہمدردی ہے۔

اپنے دیس کی خبریں

بنگلور

جناب محمد منظور احمد صاحب سکریڑی مجلس ادب بنگلور لکھتے ہیں کہ مجلس ادب بنگلور کا دوسرا سالانہ اجلاس بروز اتوار مورخہ ۱۹ اگسٹ سنہ ۱۹۵۱ع آزاد ہائی اسکول بنگلور میں اعلی پیمانے پر منایا گیا شہر کے تمام شعراء ادیب اور سخن شناس احباب نے شرکت کی جلسے کی صدارت جناب محمد اسمعیل صاحب تابش مدیر پاسبان بنگلور نے فرمائی۔

کارروائی قراۃ قرانی سے شروع ہوئی۔ جس کے بعد جناب مظہر اللہ صاحب نے عالیجناب قاضی محمد عبدالغفار صاحب سکریڑی انجمن ترقی اردو ہند علی گڈہ کا پیغام پڑھکر سنایا جسمیں جناب موصوف نے لکھا ہے کہ "یہی وقت ہے جو اردو دانوں کی محنت اور اخلاص کا صحیح متقاضی ہے انہوں نے مجلس ادب بنگلور کی سرگرمیوں اور خدمات کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ مجلس ان سرگرمیوں کو جاری رکھیگی۔

اس کے بعد سکریٹری مجلس ادب نے سالانہ رپورٹ پڑھتے ہوئے اور دو سال کی کارروایوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عوام اور حاضرین سے تعاون کی اپیل کی کہ مجلس ادب کی کامیابی اردو کی کامیابی ہے۔صدر کی مختصر تقریر کے بعد جناب مظہر امید صاحب نے "سیاہ پردے" اور راؤ آنند صاحب نے "اڑوس پڑوس" افسانہ پڑھا جناب محمود شریف نے "ساحر کی شاعری" اور جناب م اسمعیل صاحب نے مجلس ادب کا نصب العین پیش کیا۔

حکیم محمد امام امامی سکریٹری انجمن ترقی اردو بنگلور نے "نوجوانوں سے خطاب" محمود شریف نے جنگ۔ جناب سلیمان صاحب پرواز نے نظمیں پر نظم جوش اور مظہر امید صاحب نے محترمہ ممتاز ادا صاحبہ کی آزاد نظم پڑھی آخر میں غزلوں کا دور ہوا جسمیں حضرت اثیم بنگلوری منشی اجل صاحب بنگلوری، جناب فاضل وغیرہ نے حصہ لیا سب سے آخر میں لالہ خوب چند آزاد صاحب نے ایک چھوٹا سا مضمون قانونی سماعت سنایا۔

صدارتی تقریر میں جناب صدر نے اراکین مجلس ادب کے معیار کی تعریف کی اور اسکی گذشتہ دو سال کی کارروائیوں کے پیش نظر عوام سے اپیل کی کہ مجلس سے ہر طرح کا تعاون کریں انہوں نے امید ظاہر کی کہ اگر یہی کوشش جاری رہی تو بہت جلد اراکین مجلس ہندوستان کے بلند پایہ اہل قلم کی صف میں آسکتے ہیں۔ صدر موصوف نے مجلس کے نصب العین کے متعلق کہا کہ یہہ بہت بلند اور پاک ہے اسکی کامیابی پر ہر انسانیت کی فلاح و بہبودی کا انحصار ہے ترقی پسند ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر صاحب نے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں کا مقصد بلند اور نیک ہے لیکن اسکی کامیابی کے لئے انکو چاھئے کہ موجودہ روش بدل دیں اور اپنے ادب میں روحانی روایات اور مذہب کو بھی موزوں جگہ دیں۔ آخر میں جناب مظہر اللہ صاحب نے مجلس کی جانب سے سب کا شکریہ ادا کیا۔

کلیان

ایم بی چودھری صاحب صدر بزم فروغ ادب اطلاع دیتے ہیں کہ:۔

بزم فروغ ادب کے زیر اہتمام بتقریب جشن آزادی ۱۵ اگست ۱۹۵۱ع کی شب میں بمقام ڈاکٹر انصاری چوک، زیر صدارت عالی جناب محمد باقر ناز میونسپل کونسلر ایک محفل شعرو سخن منعقد ہوئی،جسمیں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی مشاہیر شعراء بھی شریک تھے۔

جناب آوارہ سلطانپوری، جناب بیتاب بھمڑوری، جناب فیضی نظامپوری، جناب پیکر تھانوی اور جناب گوپال سنگھ شاھد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آئندہ ماہ کے لئے متفقہ رائے سے یہہ مصرع تجویز کیا گیا:۔

ع "اشارہ ہے کسی کی اک نظر کا"

علیگڈھ

۳ ستمبر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر مقبول احمد لکچرر شعبہ عربی جو حال ہی میں یورپ سے واپس آئے ہیں "وارسا امن کانفرنس پر اپنا رپورتاژ پڑھا۔ سکریٹری نے پچھلی مجلس عاملہ کی رپورٹ پیش کی اور سال بھر کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد نئے سال کے لئے حسب ذیل عہدے داروں کا انتخاب ہوا۔
صدر:۔ ڈاکٹر عبدالعلیم۔ سکریٹری:۔ اولاد احمد صدیقی۔ جوائنٹ سکریٹری:۔ شہاب جعفری
اراکین مجلس عاملہ:۔ انجم اعظمی، عزیز عالم جاوید کمال شارق۔

علیگڈھ ۳۰ اگست کو انجمن اردو معلی کا جلسہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صدارت میں ہوا جس میں شعبہ اردو کے اساتذہ و طلباء کے علاوہ مولانا ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر عبدالعلیم عنارالدین احمد آرزو، خلیل الرحمن اعظمی، احسان رشید صدیقی وغیرہ نے بھی شرکت کی سب سے پہلے اراکین انجمن نے ان ادباء و شعراء کے متعلق تعزیتی تجاویز پاس کیں جو پچھلے دنوں ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر تاثیر، سیماب اکبر آبادی، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی، فلک پیما اور مولانا حسرت موہانی کی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا اور یہہ تجویز پیش کی گئی کہ ان بزرگوں کے متعلق مستند اہل قلم سے مقالات لکھوائے جائیں اور انجمن اردو معلی کے جلسوں میں انہیں پڑھا جائے تاکہ ہم ان کے کارناموں کا جائزہ لیکر ان کی قدر و منزلت کر سکیں۔ اس کے بعد صدر جلسہ کی تحریک سے یوم حسرت کا پروگرام طے کیا گیا۔ یوم حسرت ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۵۱ کو منایا جائے گا جس میں انجمن اردوئے معلی کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند، انجمن ترقی پسند مصنفین اور مسلم یونیورسٹی یونین بھی شریک ہوگی اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کرین گے اور تین نشستیں ہوں گی۔

(۱) پہلی نشست جو صبح کو ہوگی اس کی صدارت قاضی عبدالغفار صاحب کرین گے اس میں حسرت کی شاعری پر تنقیدی مقالات پڑھے جائیں گے۔

(۲) دوسری نشست سہ پہر میں ہوگی جس کی صدارت حضرت اثر لکھنوی کرین گے۔ اس میں آنکی زندگی اور سیرت پر مقالات پڑھے جائیں گے۔

(۳) شب میں مشاعرہ ہوگا جس کی صدارت رشید احمد صدیقی کرین گے۔ اس میں باہر کے شعراء کو بھی مدعو کیا جائے گا اور حسرت کی غزلوں کے ریکارڈ بھی پیش کئے جائیں گے۔ ان جلسوں میں شرکت کرنے اور مقالات پڑھنے کے لئے آل احمد سرور، احتشام حسین، پنڈت کشن پرشاد کول، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ احمد فاروقی وغیرہ کو دعوت دی جائے گی۔ اور مشاعرے میں آنند نراین ملا، عجاز لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی وغیرہ کو مدعو کیا جائے گا۔

یوم حسرت کے بعد انجمن اردوئے معلی حسرت پر دو کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بھی رکھتی ہے۔ ایک حسرت کی شاعری اور زندگی کے بارے میں مقالات پر مشتمل ہوگی۔ دوسری کتاب میں خود حسرت کے نایاب تنقیدی و علمی مضامین جمع کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ انجمن نے یہہ بھی طے کیا ہے کہ حسرت کے نام پر ایک انعام بھی رکھا جائے جو ہر سال مسلم یونیورسٹی کے اس طالب علم کو دیا جائے گا جس کا مقالہ، طویل نظم یا کوئی اور ادبی تخلیق بہترین قرار دی جائے گی۔

یو پی میں اردو

الہ آباد یونیورسٹی کے استاد اردو کپتان ضامن علی صاحب ایم اے نے پچھلے چھ سات سال سے متعلق اعداد ذیل فراہم کئے ہیں (۱) امتحان ہائی اسکول میں :-

۱۹۴۵ میں	کل طلبہ	ہندی لینے والے	اردو لینے والے
۱۹۴۶ میں	27,262	16,300	9,282
۱۹۴۷ "	33,621	22,192	11,429
۱۹۴۸ "	40,437	26,745	19,840
۱۹۴۹ "	52,172	35,859	14,484
۱۹۵۰ "	71,555	50,181	14,652
۱۹۵۱ "	ایک لاکھ سے اوپر	اعداد ہی فراہم نہ ہو سکے	

(۲) امتحان انٹرمیڈیٹ میں

۱۹۴۵ میں	8,549	5,426	2,978
۱۹۴۶ "	10,592	6,505	3,394
۱۹۴۷ "	12,342	7,778	4,041
۱۹۴۸ "	13,721	9,152	3,964
۱۹۴۹ "	18,562	12,746	4,879
۱۹۵۰ "	34,539	17,220	6,076
۱۹۵۱ "	36,248	25,604	7,379

گویا یو پی میں جو زبان زیادہ سے زیادہ صرف ایک اقلیت کی ما[illegible] کہی ہے بلکہ کے وجود ہی سے انکار کرنا ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں نے عین دیانت سمجھ لیا ہے امتحانوں میں لینے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود رہا کئے ہیں۔ [illegible] کے بعد بھی پھر اتنی بڑی زبان کو مٹا کر کچل کر دبا کر کیا ہندستان سمجھتا [illegible] میں نسل کشی کی دفعہ کی زد میں آنے سے بچا رہ سکے گا؟ (ص-ق)

مصنف غالب انسائکلوپیڈیا کے نام

کھلی چٹھی

خیر صاحب!

مارچ ۱۹۵۰ع کے نگار نے جب یہ خبر سنائی کہ آپ غالب انسائکلوپیڈیا مرتب کر رہے ہیں۔ تو بے اختیار مہدی مرحوم کا ایک فقرہ یاد آگیا جو انہوں نے میر ناصر علی دہلوی ایڈیٹر صلائے عام کو لکھا تھا یعنی "اس وقت تک دنیا نے آپ کا صحیح مصرف نہیں سمجھا تھا" اور اب تو میرے دل کا چور بھی نکل آیا۔ میں آپ سے اس زمانہ سے واقف ہوں جب میرے اندر کسی قسم کا ادبی شعور نہیں تھا لیکن میرے خاندان کے جن لوگوں سے آپ کے گہرے مراسم تھے ان کی قابلیت اور علمی ذوق پر بجائے اس زمانے میں بھی اعتماد تھا اور آج بھی ہے کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی اسی زمانے سے گھر میں مشرق [illegible] عدم اور صحت کے چرچے [illegible] معارف اور رفقائے آزاد اصفہانی کے ساتھ اس دنیا کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ میں ریاض خیر آبادی، وصل بلگرامی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی آئے تھے [illegible] خیر آبادی رہتے تھے اور مشرق کی [illegible] عمامہ و دستار کے بجائے "پیام یار" کے سے بندھی ہوئی تھی اور اسی مسجد کے سایہ میں جہاں والد صاحب مرحوم حدیث کا درس دیا کرتے تھے میری طرح کے تو عمر لڑکے اس قسم کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔

کلا بیٹھا ہوا، خدمت اذان کی اور کعبے میں
بھلے کو ہم دیا لائے تھے ناقوس برہمن کا

انہیں لوگوں کی زبانی اکثر آپ کا ذکر سنتا تھا اور کبھی کبھی تو آپ پر بڑا رشک آتا تھا کہ سالہا سال "خیام الہند" اور "[illegible]" کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں، ان کی [illegible] سنی ہیں اور ان کی رنگ رلیوں میں شریک ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق جب کوئی یہ کہتا کہ [illegible] سمجھ [illegible]

اور اس سے زیادہ سخن فہم تو اس جلسے کے دوسرے حصے سے کچھہ دکھہ ہوتا تھا۔ میں اس زمانے میں سخن سنج ہونا تو بڑی بات سمجھتا تھا لیکن "سخن فہم" ہونے کے اندر مجھے کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی تھی۔ آج دس بارہ سال کے بعد جب شعور کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد میں اس جگہ پر آگیا ہوں جہاں آکر مجھے بھی شعر و ادب ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا پڑا اور یہاں آکر اس تلخ حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ آج شعر کہنے والے اور سخن سنج کہلانے والے تو ہزاروں اور لاکھوں ہیں لیکن سخن فہم کا پتہ لگایا جائے تو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا اور اگر واقعی ہمارے یہاں سخن سنج موجود ہوتے تو اردو شاعری کو آج یہہ دن دیکھنے نہ پڑتے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد جن رومانی نظموں پر لوگ ٹوٹتے تھے آج ان میں کوئی رس باقی نہیں رہا اور بیچارہ نئی نسل کا شاعر ہاتھہ پیر مار رہا ہے کہ کدھر جائے ہمارے پیش روؤں نے تو راستے ہی کو گم کردیا ہے میرے کہنے کا مطلب یہہ ہے کہ آج لفظ "سخن فہم" کو یاد کر کے پھر میں نے بہت لطف لیا! اور یہہ بھی پتہ چلا کہ آپ کی جگہ کہاں ہے۔ ان ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے انبوہ کثیر میں یا اُنے گنے دو چار ادمیوں میں۔

لیجئے اب یہہ بھی آپ کو بتادوں کہ سخن سنجی کے میدان میں یہہ ہجرت، اردو ادب کے لئیے، بڑی مفید ثابت ہوئی اور آپ کی وہ ازلی سخن فہمی اب پوری طرح مسلح ہو کر میدان میں آرہی ہے جس کا پہلا ثمر پیش رس مہندی کی زبان میں غالب انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ وہ ایک مدت تک شاعری کرتا رہا لیکن باوجود اپنی بے پناہ قابلیت، کے خود اس نے اپنی شاعری کے بارے میں یہہ رائے قایم کی کہ اس میں سب کچھہ ہے سوائے شاعری کے۔

(In my poetry, there is every thing except poetry)

اور اسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اس نے لغت کا وہ کام شروع کیا جس کی وجہ سے وہ آج انگریزی ادب میں غیر فانی ہے۔ آپ کی غالب انسائکلوپیڈیا جب مکمل ہو کر شائع ہوجائے گی تو میں اس لطیفے کو آپ کے ساتھہ منسوب کر کے لوگوں کو سناؤں گا۔

غالب انسائکلوپیڈیا کے بارے میں آپ کے ذھن میں نہ جانے کیا کیا خاکے ہوں گے اور اس کے ذریعہ کتنے خزانے اور جواھر ریزے پیش کیئے جائیں گے لیکن میں نے بھی دو ایک باتیں سوچی ہیں جو آپ کے گوش گزار کردینا چاھتا ہوں اس سے مقصود آپ کو کچھہ بتانا نہیں بلکہ اپنے ذوق کی نمایش ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہہ ہے کہ اس کتاب میں ان تمام لوگوں کے حالات بھی جمع کئے جائیں جن سے غالب کے کسی نہ کسی طرح کے تعلقات تھے اور جن کے نام غالب نے خطوط لکھے ان میں سے بہت سے صاحب دیوان ہیں ان کے دواوین کا بھی پتہ چلایا جائے۔ اور ان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بہم پہنچائی جائیں اور اگر ہوسکے تو ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا جائے۔ اگر یہہ کام ہوجائے تو میرا خیال ہے کہ نہ صرف غالب کے قدر دانوں اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئیے یہہ ایک بہترین چیز ہوگی بلکہ غالب کی شاعری اور ان کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی ہمیں اس سے بہت کچھہ مدد ملے گی دوسری بات یہہ ہے کہ آپ ان تمام مضامین کا ذکر کریں گے جو غالب پر لکھے گئے ہیں یا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح غالب سے ہے۔ اس سلسلے میں ایک مضمون کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاھتا ہوں وہ مولانا اقبال احمد سہیل کا مضمون ہے جو انہوں نے بیخود موہانی کی کتاب گنجینۂ تحقیق

کی اشاعت پر لکھا تھا اور غالباً سنہ ۱۹۳۰ع کے "معارف" میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں غالب اور ذوق کا موازنہ اور غالب کے بعض اشعار کی شرح ایک نئے انداز سے پیش کی گئی ہے۔ اور غالب کے سلسلے میں یہہ مضمون میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کے علاوہ چند اور مضامین میرے ذہن میں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی نظر سے گذر چکے ہوں گے پھر بھی احتیاطاً لکھہ رہا ہوں

(۱) غالب اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف۔ علی عباس حسینی کا مقالہ ہے جو زمانہ سنہ ۲۹ میں شائع ہوا تھا۔

(۲) غالب اور بجنوری

(۳) غالب کی عشقیہ شاعری

یہہ دونوں مقالے آفتاب احمد کے ہیں۔ پہلا مقالہ ادب لطیف سنہ ۴۵ میں اور دوسرا ساقی سنہ ۴۶ میں شایع ہوئے۔

(۴) غالب پر ایک ناقدانہ نظر۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی کا مقالہ ہے جو علی گڈھ میگزین اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ع میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ان اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو عام طور سے غالب پر کئے جاتے ہیں۔

حال ہی میں ایک مضمون ستمبر سنہ ۱۹۵۰ع کے نگار میں "غالب اور مفتی محمد عباس" پر مرتضی حسین فاضل لکھنوی کا شایع ہوا ہے آپ سے بھی نہ بھولئے گا۔

یہئے دو مضامین اور یاد آئے "غالب اور قنوطیت" کے عنوان سے میرے بڑے بھائی مولوی عبدالرحمن صاحب اصلاحی نے مستقبل جونپور میں ایک مضمون لکھا تھا اور اسی عنوان سے میرے دوست علی حماد عباسی کا ایک مضمون سنہ ۱۹۴۵ع یا سنہ ۱۹۴۶ع کے آج کل میں شایع ہوا تھا۔

آخر میں ایک اور صاحب کا ذکر تا ہے۔ میں پچھلے دنوں رامپور گیا تھا تو وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی جو پہلے تحصیل دار تھے اب بوڑھے ہو گئے ہیں پنشن پاتے ہیں اور گھر پر شوقیہ کتابت بھی کرتے ہیں انہوں نے غالب کے دیوان کا جواب لکھا ہے اور انہیں ردیف اور قافیوں میں اور اتنے ہی اشعار جتنے دیوان غالب میں ہیں ان کے دیوان میں بھی موجود ہیں اگر کبھی موقع ملے تو یہہ قلمی دیوان ضرور دیکھئے اور غالب انسائیکلو پیڈیا میں اس کا تذکرہ بھی کیجئے۔

غالب انسائکلوپیڈیا کی اشاعت میں اب کسی قسم کی تاخیر نہ کیجئے۔ اسے مکمل کر کے جلد سے جلد منظر عام پر لائیے۔

خلیل الرحمن اعظمی

علی گڈھ۔ ۳۱ اگست سنہ ۱۹۵۱ ع

سرود غم
(از جناب ہوش بلگرامی)

ہندستان میں تو کیا، حیدر آباد کی ادبی صحبتوں میں بھی سوائے خاص خاص احباب کے کسی کو معلوم نہیں کہ جناب ہوش بلگرامی ایک بلند مقام شاعر ہیں جو شعر صرف اس لئے کہتے ہیں کہ انکی فطرت شعر کہنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ حیدر آباد کی زندگی میں سرکار اور دربار کے حلقوں کی جو مصروفیت انسان کے اعلی کردار اور ذہنی صلاحیتوں کو برباد کر دیا کرتی ہے اس سے ہوش صاحب کو بھی بہت واسطہ پڑا۔ لیکن انکی فطرت کے تقاضے اس حال میں بھی کبھی کبھی "کنگ کوٹھی مبارک" کی بلوڈ کیوں پر حاوی ہو جایا کرتے تھے۔

ہوش صاحب، مشاعروں کے شاعر کبھی نہ تھے اور انکے متعلق یہہ کہنا بھی ان کے شاعرانہ مذاق کی توہین ہے۔ انکا مذاق ہمیشہ قدیم شاعری کی روایات سے وابستہ رہا جدید شاعری نے ان کی ذہنی فضا میں کوئی جگہ نہیں پائی۔ تاہم انہوں نے اس رنگ کی شاعری میں بھی اچھے کلام کو اپنی داد سے محروم نہیں رکھا۔

ہوش صاحب کی شاعری کے نگار خانہ میں نقش و نگار کی اتنی کثرت نہیں ہے کہ انکا رنگ پھیکا ہوجائے۔ وہ کم کہتے ہیں اسی لئے جو کہتے ہیں بہت اچھا کہتے ہیں۔

سرود غم ہوش صاحب کی غزلوں کا ایک مجموعہ ہے جو آنکے تغزل میں آنکی غمگین روح کو بے نقاب کرتا ہے اس مجموعہ کے دیباچہ میں انھوں نے خود قدیم تغزل کی بہت خامیوں کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھہ ہی وہ اپنے تغزل پر اپنی فطرت کو گواہ لاے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "میں نے جس ماحول میں آنکھہ کھولی اس میں غزل کا وہی قدیم اور عامیانہ انداز مقبول و متداول تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس رنگ سے کوئی دلچسپی نہ ہو سکی کبھی کبھی کچھہ کہا بھی تو اس پر ذوق فطری مطمئن نہ ہوسکا اس لیئے مدت تک تو میں اس خیال میں رہا کہ شعر کہنا اور وقت ضایع کرنا دونوں برابر ہیں لیکن فطرت نہیں بدلتی، زندگی میں ایسے وقت بھی آئے کہ میں شعر کہنے پر اضطراراً مجبور ہوگیا اور دل کا درد زبان پر آکر رہا۔"

ہوش صاحب کے کلام کی خصوصیت یہی دل کا درد ہے، اسکا انھوں نے اپنے کلام میں جابجا اعتراف کیا ہے۔

بتا رہا ہوں زمانہ کو ہوش راز حیات
نوائے ساز حقیقت ہے میری غم طلبی

لیکن ہوش کے شاعرانہ افکار کی ہمہ گیری "داستان غم دل" کی سرحدوں کو بھی پار کرلیتی ہے اور اونکے کلام میں جابجا ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زلف و عارض کی اور گل و بلبل کی بستیوں سے گذر کر آنکی نظر دوسری سمتوں میں بھی آنے والے انقلابوں کو دیکھہ رہی ہے۔

ہوش اب کیا دیکھئے انجام ہو
لے رہی ہے ایک نئی کروٹ سماج

فطرت مجبور ہے سمجھی ہوش
زندگی کے پار کرسے کھو رہیں آج

ابھی نہیں ہے مناسب بیان ماضی و حال
کہ ہوش یہہ تو بتائے گا عصر آیندہ

ایوان حیات اب نئے اجزا سے بنے گا
گرنے کو ہے اے ہوش یہہ ماضی کی عمارت

زمانہ ہوش بدلنے کو ہے نئی کروٹ
بجھے پڑے ہیں بہت دن سے قلب و روح و ضمیر

حقیقت یہہ ہے کہ فطری شاعر چاہے بھی تو زمانہ کے حالات سے بیگانہ وہ نہیں سکتا آسکی حساس فطرت بدلتے ہوئے موسموں کو محسوس کرنے پر مجبور ہے۔ ہوش صاحب عام سیاسی زندگی کی کشمکش سے ہمیشہ علاحدہ رہے اور آنکی شوقیہ شاعری بھی صرف اپنے ذاتی مذاق کی تسکین کے لئے قدیم اصولوں سے وابستہ رہی، لیکن فطرت جو شاعرانہ تھی عوامی زندگی کے بدلتے ہوئے موسم کا پتہ پاتی رہی۔ اس نظر سے بھی ہوش صاحب کے تغزل میں حقیقت شناشی کا پہلو بھی نمایان ہے۔

آنکے کلام کا رنگ زیادہ تر فلسفیانہ ہے اور یہہ فلسفہ بھی زیادہ تر غمناک ہے اور عبرت آموز ہے۔ وہ حسن و عشق کی اصطلاحوں میں بھی دنیا کی زندگی کے عبرت آموز پہلو نمایان کرتے ہیں اور فانی کی طرح آنکے کلام کی روح بھی غمگین ہے۔ لیکن غم آرٹ کا ایک بہت بلند مقام ہے اس لئے اپنی شاعری میں ہوش صاحب ایک صاحب فکر حسن کار ہیں

یہہ مجموعہ کلام حیدرآبادی ٹائپ میں چھاپا گیا اور جسقدر خود ہوش صاحب کا مذاق ستھرا ہے آسی قدر کتاب بھی دیدہ زیب ہے۔

ملنے کا پتہ:-

نواب ہوشیار جنگ۔ سرفراز منزل۔ برکت پورہ۔ حیدرآباد دکن

حیات اجمل

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی وہ سوانح عمری جس کا عرصہ سے انتظار تھا۔ اب تیار ہو گئی ہے۔ اس کو قاضی عبدالغفار صاحب نے مرتب کیا ہے۔ تقریباً چھ سو صفحات میں حکیم صاحب کی سیاسی اور اخلاقی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

حیات اجمل صرف حکیم صاحب کی سوانح ہی نہیں ہے بلکہ اس کتاب میں تقریباً بیس سال کی قومی جدوجہد کا پس منظر پیش کیا گیا ہے تاکہ اس زمانہ کے ماحول کی صحیح تصویر میں حکیم صاحب کی عظیم الشان شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت فی جلد آٹھ روپے۔

---:o:---

ایک مشرقی کتب خانہ

مترجمہ مبارز الدین رفعت صاحب ایم اے۔

پٹنہ ناصور فاضل ڈی۔ سی امکاٹ او کونر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مشہور کتب خانہ خدا بخش بانکی پور پٹنہ کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ اور کتب خانہ کے عربی فارسی نوادرات کی ایک ایسی فہرست بھی ترتیب دی گئی ہے جس سے ایک نظر میں پورا کتب خانہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ
قیمت فی جلد تین روپے

مذہب اور دھرم

مہاتما گاندھی کی ان تحریروں کا خلاصہ اور انتخاب ہے جس میں مہاتما جی نے مذہب و فرقہ واریت و اِدات کے متعلق اپنی زندگی کے اصولوں کو بیان کیا ہے۔

مرتبہ قاضی عبدالغفار۔ قیمت چار روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ



باہتمام عزیز حسین منیجر ایشنل پرنٹرس کیپی میں چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشر نے صدر دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا۔